© rasailojaraid.com

عالمِ اسلام کے نامور مفکرین کی نظامِ معیشت پر شہرۂ آفاق کتب

☆	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ
☆	اسلام اور جدید معاشی نظریات	"
☆	معاشیاتِ اسلام	"
☆	اسلامی نظمِ معیشت کے اصول و مقاصد	"
☆	قرآن کی معاشی تعلیمات	"
☆	اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت	"
☆	سُود	"
☆	مسئلہ ملکیتِ زمین	"
☆	اسلام میں عدلِ اجتماعی	سید قطبؒ شہید
☆	اسلام کا نظریہ ملکیت حصہ اول، حصہ دوم	ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی
☆	غیر سودی بینکاری	"
☆	انشورنس، اسلامی معیشت میں	"
☆	شرکت و مضاربت کے شرعی اُصول	"
☆	اسلام میں حلال و حرام	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
☆	اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض	پروفیسر لبیب السعید/ترجمہ خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

13-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔(پاکستان)

شو روم : 10- چیٹر جی روڈ- اُردو بازار لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکمتِ دین

مفہوم' تقاضے اور بنیادی اصول

خرم مراد

جو تحریک اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہو' اس کو جہاں ایک طرف اللہ کے دین' اس کے احکام و ہدایات اور اس کی تعلیمات کا علم ہونا چاہیے' وہاں اسے حکمت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فرائض بیان کیے ہیں' ان میں تلاوت آیات اور تزکیہ نفوس کے ساتھ ساتھ تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک "آیات" سے مراد قرآن مجید کے دلائل اور "کتاب" سے مراد قرآن مجید کے احکام ہیں' جب کہ "حکمت" کے مفہوم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

حکمت کا مفہوم

بعض کے نزدیک "حکمت" سے مراد حدیث کا ذخیرہ ہے۔ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ سمجھ بوجھ' وہ ذہن اور وہ دل و دماغ ہے جو دین کا صحیح فہم رکھتا ہو' جو دین اسلام کے احکام کے اسرار' ان کی علت اور ان کی حکمت سے واقف ہو' نیز جو مختلف حالات میں دین کو صحیح طور پر منطبق کر سکے۔

اسی طرح اسلام کے احکام کی مصلحتوں' مثلاً نماز کیوں فرض کی گئی؟ شراب کیوں حرام کی گئی؟ کا ذکر ہو یا دین کے مختلف احکام کے بارے جب بھی سوال پیدا ہو' تو یہ بھی حکمت کے دائرے میں آئے گا۔

حکمت سے مراد دین کے وہ بنیادی اصول بھی ہیں' جن پر دین کی تعلیمات کا پورا نظام قائم ہے۔ حکمت کا یہ مفہوم اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کا صحیح فہم ہو تو نہ صرف یہ کہ دین کی تعلیمات سمجھ میں آسکتی ہیں' بلکہ جن معاملات میں دین کی تعلیمات نہیں دی گئی ہیں' ان کے بارے میں بھی انسان اس فیصلے پر پہنچ سکتا ہے' جو دین کو مطلوب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ دین نے ہر موقع، ہر واقعے اور ہر حالت کی مناسبت سے احکام کی وضاحت نہیں کی ہے۔ جو دین گذشتہ چودہ سو سال ہی نہیں بلکہ آیندہ زمانے کے لیے بھی ہے، جسے تمام اقوام عالم اور انسانی معاشروں کو رہتی دنیا تک کے لیے راہ نمائی دینا ہے، اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ چند نہایت بنیادی اصولوں کی وضاحت اور ان کا تعین تو کر دے جن کے نور سے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے، مگر ہر معاملے کے لیے تمام تفصیلات کو پہلے سے نہ طے کرے۔ لہٰذا، دین کے ان اصولوں کا فہم، جن کی بنیاد پر آیندہ دینی تعلیمات کی روشنی میں نظام مرتب ہو، "حکمت" کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔

حکمت کے اس مفہوم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دین نے مختلف اصول و ضوابط کے درمیان باہمی ربط اور ان میں ترجیحات کا نظام قائم کیا ہے اور اسی بنیاد پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس باہمی ربط اور ترجیحات کے نظام کا صحیح فہم تو ضروری ہے ہی، مگر دین کو سمجھنے اور دین کی اشاعت اور اقامت کے لیے سرگرم تحریک اسلامی کے لیے، مختلف حالات کے تناظر میں، اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ موثر نظام جماعت، متوازن نظام تربیت، مختلف حالات اور مواقع پر دین کو صحیح طور پر پیش کرنے، رائے عامہ کو ہموار کرنے، موثر حکمت عملی اپنانے اور صحیح تنظیمی فیصلے کرنے کے لیے، حکمت کے اس مفہوم کا ٹھیک ٹھیک فہم حاصل کرنا، تحریک اسلامی کے لیے بڑا ضروری اور اہم ہے۔ محض چند احادیث کو یاد کر لینے اور مسائل کو ازبر کر لینے سے یا صرف قرآن مجید کو حفظ کر لینے سے، حکمت کے موثر فہم کے وہ تقاضے پورے نہیں ہوتے، جو کہ ناگزیر ہیں۔

حکمت دین کے بنیادی اصول

حکمت کے بے شمار پہلو ہیں، لیکن میں یہاں صرف ان اہم پہلوؤں کی طرف اختصار سے اشارہ کروں گا، جو میری نظر میں تحریک اسلامی کے لیے اہم ہیں۔ ایک اسلامی تحریک کے لیے، اپنے نظام کی صحیح خطوط پر تشکیل، پالیسی سازی، طریق کار کے تعین، افراد کی تربیت، دعوت کو موثر انداز میں پیش کرنے اور عوام الناس کو منظم کرنے کے لیے، ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہی وہ اصول ہیں جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔

انتخاب اور عمل کی آزادی

اس ضمن میں پہلی بات جسے قرآن مجید نے بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا کے اندر اپنے عمل کی آزمایش کے لیے آیا ہے۔ بہ ظاہر تو یہ بات بڑی سادہ اور عام ہے لیکن اس کے مضمرات، نتائج اور تقاضے بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کو زبان سے دہراتے ہیں، وہ بھی اس کے مفہوم سے ناواقف ہوتے ہیں، اور جو اس کو جانتے ہی نہیں وہ تو اس سے ناواقف ہیں ہی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروری ہے کہ اس اصول پر ذرا تفصیل سے غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کون کون سے اہم پہلو ہیں جو اس ایک اصول میں مضمر ہیں۔

قرآن مجید نے حکمت دین کا پہلا اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (الملک ۶۷: ۲)

جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے۔

انسان کو زندگی اور عرصہ حیات بخشنے کا بنیادی طور پر یہی مقصد ہے۔ اس اصول کا پہلا اہم تقاضا یہ ہے کہ انسان کو ارادے، انتخاب اور عمل کی آزادی دی جائے۔ کسی امتحان میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے جب تک کہ امتحان دینے والے کو انتخاب اور عمل کی آزادی حاصل نہ ہو۔ یہ انسان کی بالکل بنیادی آزادی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے۔ اگر اس پر کسی قسم کا کوئی جبر ہو اور جبر کے تحت وہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہو تو پھر ان اعمال کی حد تک وہ اللہ کے ہاں جواب دہ نہیں ہے۔۔۔۔ اسلام میں جزا اور سزا کا پورا نظام اسی اصول کے تحت قائم کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی جنت اور دوزخ کا ذکر آیا ہے، وہاں یہی کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے عمل کی بنیاد پر جنت کا مستحق ٹھیرے گا یا رحمت کی بنیاد پر؟ اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ دراصل اعمال کی بنیاد پر ہی انسان رحمت کا مستحق ٹھیرے گا۔ بے عمل آدمی، رحمت کا مستحق نہیں ہو گا۔ جس نے عمل کی کوشش کی ہو گی وہی اللہ کی رحمت کا مستحق ہو گا، اللہ کی رحمت اسی کی دست گیری کرے گی اور وہی جنت میں داخل ہو سکے گا۔ جس کے اعمال لعنت کے مستحق ہوں گے، اسے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جائے گا اور رحمت سے یہ دوری اسے جہنم میں لے جائے گی۔

اگر کسی کے ذہن میں ان دونوں باتوں کے بارے میں کوئی الجھن ہے، تو اسے قرآن پر غور کرنا چاہیے۔ قرآن نے واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تو ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا ذکر ہم قدیم صحیفوں یعنی صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ سورۃ النجم میں ارشاد ہے:

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ○ وَاِبْرٰھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی ○ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ○ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ○ ثُمَّ یُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ○ (النجم ۵۳: ۳۶-۴۱)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰؑ کے صحیفوں اور اس ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ "یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے' اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی"۔

قرآن مجید نے یہاں یہ بات بالکل صاف اور واضح طور پر کھول کر بیان کر دی ہے' کہ یہ تو ابدی تعلیم ہے اور ان تعلیمات میں سے ہے جو دین کی بنیاد ہیں۔ اسی لیے حضرت آدمؑ کو جنت میں داخل کرتے ہوئے اللہ نے انھیں یہ اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو پھل کھائیں اور چاہیں تو نہ کھائیں۔ اسی اختیار کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے پھل کھایا' جب کہ فرشتوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھیں حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے سجدہ کیا' اس لیے کہ وہ مجبور تھے۔ حضرت آدمؑ کو مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ انھیں اختیار کی آزادی دی گئی تھی۔ اس چیز نے ان کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہستی بنا دیا تھا۔ وہی آدمی جواب دہ ہو سکتا ہے اور اسی سے باز پرس ہو سکتی ہے' جس کو آزادی دی گئی ہو۔ چنانچہ قرآن مجید نے انبیا کرامؑ کو بھیجنے کی بھی یہی علت بیان کی ہے' کہ ہم نے انبیا علیہم السلام کو ہدایت کے ساتھ اسی لیے بھیجا' تاکہ تمھارے پاس ہمارے خلاف کوئی حجت نہ رہے' اور کل تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ دین کیا ہے؟ اور ہدایت کیا ہے؟ ہم دین پر کیسے چلیں اور اللہ کی مرضی کس طرح پوری ہو؟

اسی طرح ایمان کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تم کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ تم جس کو چاہو ایمان کی راہ پر لے آؤ' یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اللہ کی مشیت ساتھ نہ دے اور اس کے قانون کے تحت یہ کام نہ ہو' تو کوئی آدمی ہدایت نہیں پا سکتا۔

اللہ نے اس بات کو کھول کر یوں بیان کیا ہے کہ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ ○ (ق ۵۰: ۳۷)

اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو' یا جو توجہ سے بات کو سنے۔

گویا قرآن میں بھی ہدایت اس کے لیے ہے جو دماغ سے سوچنے اور کان سے سننے کے لیے تیار ہو۔ جو سنتا' دیکھتا اور سوچنا نہ چاہے' وہ اس سے ہدایت نہیں پا سکتا۔ نبی کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ حق کو بیان کر دے' لوگوں کے سامنے اسے آشکار کر دے اور حق کو قائم کرنے کی کوشش کرے۔ پھر فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (الکہف ۱۸: ۲۹) "اب جس کا دل چاہے مانے' جس کا دل چاہے وہ انکار کر دے" کے مصداق لوگوں کو اس بات کی آزادی ہو گی کہ چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔

انسان کو حق قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اور آزادی دی گئی ہے۔ یہ نبی کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ لوگ اس کی ہدایت پر ضرور اسلام قبول کریں۔ نبی کو داروغہ' تھانیدار یا جرنیل بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبردستی لوگوں کو دین میں لے آئے۔ لا اکراہ فی الدین (البقرہ ۲:۲۵۶) "دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے"۔ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا، اگر زبردستی ہو گی تو یہ انسان کی آزادی کے اندر مداخلت ہو گی جو حکمت دین کے خلاف ہے۔

انسان کو اس بات کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ تباہی کے راستے پر جائے یا نجات کی راہ پر چلے، چاہے تو تقویٰ کی راہ اختیار کرے یا فجور کی راہ، اور چاہے تو اپنے نفس کا تزکیہ کرے یا خواہشات نفس کی پیروی کرے۔ اس کو یہ سارے اختیارات آزادی عمل کے تحت دیے گئے ہیں۔ جو بھی اس آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا، وہ دراصل زندگی کے بنیادی مقصد میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ یہ اصول بھی قرآن و حدیث میں متعدد جگہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ وہی نیکی کام آئے گی جو آدمی اپنے ارادے سے کرے گا۔ اگر آدمی غلطی سے یا کسی جبر کے تحت کوئی غلط کام کر بیٹھے تو اس پر اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

اس اصول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ یہ آزادی و خود مختاری اس کے امتحان کے لیے ضروری ہے۔ موت کے بعد جزا اور سزا کا پورا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ آدمی اسی لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے کہ اسے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس مسئلے کا کوئی تعلق جبر و قدر کے مسئلے سے نہیں ہے کہ آدمی مجبور ہے۔ ایک ہی چیز کو دیکھنے کے کئی پہلو اور کئی زاویے ہوتے ہیں۔ اگر اس پوری کائنات کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت تصور کیا جائے تو یہاں کوئی فرد، کوئی کام بھی اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں کر سکتا۔ اگر ایک شخص اپنے ہاتھ سے چوری کرنا چاہے تو ہاتھ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، اس لیے جب تک ہاتھ چوری میں اس کا ساتھ نہ دے، اس وقت تک وہ چوری نہیں کر سکتا۔ گویا جب تک اللہ کی مشیت اس کا ساتھ نہ دے، اس وقت تک وہ چوری نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لیے مشیت کو ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا، اس لیے کہ ہاتھ استعمال کرنے کا ارادہ تو اس کا اپنا ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ہم نے دل پر مہر لگا دی یا ہم نے یہ کام کروا لیا ہے، تو وہ یہ بات مالک ارض و سموات کی حیثیت سے فرماتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی سطح پر مخاطب کرتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ اس امر کے تم خود ذمہ دار ہو، کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ آزادی عمل کا اختیار تمھیں حاصل ہے۔ تم چاہو تو جھوٹ بولو یا سچ، ظلم کرو یا انصاف، نیکی کی راہ اختیار کرو یا بدی کی راہ، تمھیں اس امر کی مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہے۔ اگر کہیں تم ثابت کر دو کہ تم مجبور تھے تو ہم تم سے اس پر کوئی مواخذہ نہیں کریں گے اور تمھیں کوئی سزا نہیں دیں گے۔ اسی طرح اگر کبھی تم بدی کرنے پر مجبور ہو جاؤ یا کسی نے تمھارا ہاتھ پکڑ کر کوئی برا کام تمھارے ارادے اور مرضی کے خلاف تم سے کروا لیا تو اس کے بھی تم ذمہ دار نہیں ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی لیے انسان کا کوئی عذر قیامت کے دن سنا نہیں جائے گا۔ مگر اس کھلی حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی بخشی گئی ہے' وہاں بھی انسان یہی عذر پیش کرے گا کہ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰھُمْ (الزخرف ۴۳: ۲۰) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم بتوں کی پرستش نہ کرتے۔ اللہ فرمائے گا: نہیں! یہ بات غلط ہے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمارے آباو اجداد نے ہمیں اسی بات کی تعلیم دی تھی۔ وہ صدیوں سے یہی کام کرتے چلے آئے تھے۔ انسان کمزور ہے' معاشرے میں ڈھل جاتا ہے' ہم بھی تو آخر انسان ہی تھے' کیا کرتے؟ مجبور تھے۔ مگر یہ عذر بھی قبول نہیں ہو گا۔ لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارے بڑے اور بزرگ تھے جو ہمارے آگے آگے جا رہے تھے' اس لیے ہم ان کے پیچھے چلے گئے' یا یہ کہیں گے کہ یہ ہمارے پیر' پروہت' پجاری اور حکمران تھے' اس لیے ہم نے ان کی پیروی کی۔ کہا جائے گا: نہیں' یہ عذر بھی قابل قبول نہیں۔ پھر لوگ اللہ سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو ہم سے زیادہ عذاب دیا جائے۔ اس پر اللہ فرمائے گا' نہیں' سب کے لیے یکساں عذاب ہے۔ بعد میں آنے والے کہیں گے کہ یہ تو پہلے جانے والوں کا طریقہ تھا جس پر ہم چل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا' نہیں: پہلے والے اور بعد والے' دونوں کے دونوں آگ کے عذاب میں جلیں گے' کوئی اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام پہلو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بڑی تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی تصور ہے جس پر سارا دین قائم ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کے لیے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے اس کو ارادے و اختیار کی آزادی دی ہے۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس راہ پر چاہے' چلے۔ اپنے نفس کو جس راہ پر چلانا چاہے' چلائے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہے جس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اگر یہ آزادی اس کو حاصل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا جزا اور سزا کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔

تحریک اسلامی کے لیے اہمیت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اصول کا تحریک اسلامی سے کیا تعلق ہے؟ ملکی حالات کے تناظر میں' تحریک اسلامی کی حکمت عملی یا جماعت کے نظم اور نظام تربیت سے اس کا کیا تعلق ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حکمت دین کے اس پہلو کا تحریک اسلامی کے نظم' نظام تربیت اور حکمت عملی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ تحریک کے عملی تقاضوں اور عملی نتائج پر اس کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگرچہ قرآن و سنت میں واضح طور پر کہیں بھی ایسے اصول یا احکام نہیں دیے گئے ہیں کہ کن حالات میں کیا کرنا چاہیے' مثلاً مخصوص حالات میں کسی فرد' جماعت یا حکومت وقت کے ساتھ کیا پالیسی یا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ ---- لیکن اگر تحریک اور دین کا کام کرنے والے حکمت کے اس مفہوم کو بخوبی سمجھ لیں کہ مخصوص حالات میں تحریک اسلامی کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے یا کیا حکمت عملی اپنانا چاہیے؟ تو اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے ایسے راہنما اصول بن سکتے ہیں، جن کی روشنی میں بہت سے معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ گویا تحریک اسلامی کے لیے حکمت دین کا یہ پہلو اور اصول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

طریق دعوت کا تعین

اس ضمن میں پہلی بات طریقہ کار سے متعلق ہے۔

قرآن مجید نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ دین کو پھیلانے اور غالب کرنے کا طریقہ کار صرف تبلیغ کا طریقہ کار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار قابل قبول نہیں ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے اور اللہ کی زمین پر عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لیے تو انسان قوت استعمال کر سکتا ہے مگر لوگوں کو دین کی طرف بلانے اور دین قبول کرنے کے لیے قوت کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے جہاں بھی مسلمانوں نے ملک فتح کیے، لوگوں کو پوری مذہبی آزادی دی۔ اگر کوئی عیسائی رہنا چاہے تو وہ عیسائی رہے، اپنے قانون پر ہی عمل کرے اور معاملات کے فیصلے اپنے قانون کے تحت کروانے کے لیے اپنی عدالتیں الگ سے بنائے۔ اسی لیے عالم اسلام میں یہودیوں کی عدالتیں الگ تھیں اور عیسائیوں کی عدالتیں الگ۔ ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجا گھروں اور عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا اور نہ عبادت کرنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی لگائی گئی۔ اس کے لیے اس وقت بھی قرآن مجید کا یہی اصول سامنے تھا کہ جو اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق، جس مذہب پر چلنا چاہے، وہ اس پر چل سکتا ہے۔ اس میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کا طریقہ ہی دین کا بنیادی طریقہ ہے۔ تبلیغ کے ذریعے عام آدمی کو متاثر کر کے، دین کے لیے کھڑا کرنا ہی اقامت دین کا صحیح طریقہ ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں تحریک اسلامی نے اقامت دین کا طریقہ کار متعین کیا ہے اور اسے اپنے دستور کا حصہ بنایا ہے۔ جس کے مطابق تبلیغ اور تلقین کے ذریعے لوگوں کی فکر کو بدلنا، رائے عامہ کو ہموار کرنا اور انھیں منظم کر کے تبدیلی لانا ہے۔ یہ ہمارا بنیادی طریقہ ہے۔ یہ طریقہ دین کے اس محکم اصول سے ثابت ہوتا ہے جس کے مطابق انسان امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ وہ دین کو قبول یا رد کرنے میں آزاد ہے۔ اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی خاص راستے کو اختیار کرے۔

اگر غور کریں تو تبلیغ کے لیے چند شرائط ضروری ہیں:

تبلیغ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ کہنے والے کو کہنے کی آزادی میسر ہو۔ اگر کہنے والا اپنی بات کہہ نہیں سکتا تو اس کی بات پہنچ نہیں سکتی، ابلاغ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کہنے والے کو بات کہنے کی آزادی ہونی چاہیے اور سننے والے کو بات سننے کی۔ اس لیے تبلیغ کا عمل تو اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے، جب سننے والے کو سننے اور قبول کرنے کی آزادی حاصل ہو اور پھر جسے وہ قبول کر لے، اس پر چلنے کی اسے آزادی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف حوالوں سے اس پہلو کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ تم ان کا راستہ کیوں روکتے ہو؟ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانفال ۸ : ۴۷)' یا یہ کہ اللہ کے راستے سے روکنا کبائر گناہ میں سے ہے۔ اسی طرح لوگوں کو اپنے ضمیر اور عقیدے کے مطابق چلنے کی آزادی نہ دینے کو قرآن نے وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ ۲ : ۲۱۷) (اور فتنہ خون ریزی سے شدید تر ہے) قرار دیا ہے۔ گویا خون بہانے سے بڑا جرم یہ ہے کہ انسانوں پر یہ جبر کیا جائے کہ ان کو ان کے گھروں سے اس جرم میں نکالا جائے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ ان کا راستہ روکا جائے اور ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالی جائے یا ان کی بات نہ سنی جائے' محض اس لیے کہ یہ ہمارے دین کو نہیں مانتے۔ یہ تمام باتیں تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ اور انسان کی آزادی رائے پر قدغن ہیں۔

یہ وہ بنیادی آزادی ہے جس کا قرآن بڑی شدت سے تحفظ کرتا ہے۔ وہ کہیں نہیں کہتا کہ تبلیغ کے لیے جبر سے کام لو۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی عقل سے کام لو' اپنے کانوں سے سنو' اپنی آنکھوں سے دیکھو' اپنے دماغ سے سوچو اور حق کو پہچاننے کے بعد اسے قبول کر لو۔ وہی راستہ تبلیغ کے لیے موثر راستہ ہے جس میں سننے کی بھی آزادی ہو' سنانے کی بھی آزادی ہو اور قبول کرنے کی بھی آزادی ہو۔ گویا آدمی جس بات کو حق پائے اور اسے قبول کر لے تو اس پر چلنے کی بھی اسے آزادی حاصل ہو۔ اب اسے جمہوریت کہا جائے یا بنیادی حقوق یا کوئی بھی اصطلاح استعمال کی جائے' ممکن ہے چھٹی صدی میں اس کے لیے کوئی اور اصطلاحات ہوں یا تیسویں صدی میں کوئی دوسری اصطلاحات آ جائیں' لیکن بنیادی طور پر سب کی روح یہی ہے۔

آج اتنے سال گزرنے کے بعد لوگ پوچھتے ہیں' کہ آخر تحریک اسلامی کو جمہوریت سے کیا عشق ہے؟ جمہوریت نے ملک کو کیا دیا ہے؟ یہ سوال اٹھانے والے احباب دراصل اس بنیادی بات کو نہیں سمجھتے اور دین کی اس بنیادی حکمت سے ناآشنا ہیں جس کی بنیاد پر تحریک نے اپنا طریقہ کار متعین کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس ملک میں بنیادی آزادیاں برقرار رہیں' یعنی بات کہنے سننے کی آزادی' اپنے عقیدہ و نظریہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی اور ملکی نظام کو آزادی رائے کا احترام کرتے ہوئے چلانے اور دلیل سے تبدیل کرنے کی آزادی۔

مسئلہ طریق انتخاب کا نہیں ہے' بلکہ یہ اس بنیادی اصول کا مسئلہ ہے جس کے مطابق انسان امتحان گاہ میں ہے' اور وہ اپنے لیے راہ زندگی منتخب کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے اس کو دوسرے کی بات کو سننے' قبول کرنے اور اپنے عقیدے اور رائے کے مطابق چلنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اسے حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے نظام بنائے' جس میں اسے ان آزادیوں کا تحفظ مل سکے۔ نظام کے خدوخال اور تفصیلات ہر زمانے میں' ہر معاشرے میں اور ہر ملک میں مختلف ہو سکتے ہیں' لیکن اس کی بنیادی روح کو مجروح نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی لیے قرآن مجید ان تمام حکمرانوں اور سرداروں کی مذمت کرتا ہے جو حق کا راستہ روکتے ہیں، اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور لوگوں کو اس راہ حق پر چلنے سے جبری طور پر روکتے ہیں۔ یہ بات کسی صورت میں برداشت نہیں کی جاسکتی کہ انسان کے اوپر کسی بھی قسم کی جبریت اور آمریت مسلط کی جائے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

فریضہ اقامت دین کے حوالے سے تحریک اسلامی کے کارکنوں میں ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قرآن کی آیت: وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ (یٰس ۳۶:۱۷) اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے، یا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (الشوریٰ ۴۲:۴۸) تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، کی روشنی میں ہمارا کام بس اتنا ہے کہ ہم تبلیغ کر دیں اور اپنی بات پہنچا دیں۔ اس سے زیادہ جدوجہد کرنا اور نظام کو قائم کرنے کے لیے محنت کرنا، یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ درحقیقت یہ بات آیت کے صحیح مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کہی جاتی ہے۔

جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری بنیادی ذمہ داری جس کے لیے تم جواب دہ ہو، وہ دراصل حق بات پہنچانا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ عوام الناس تک حق بات پہنچانے کے بعد اسلامی نظام اور دین کا قائم ہونا یا شریعت کا نافذ ہونا، یہ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ یہ لازماً کر کے دکھا دے۔ اگر وہ کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو، تو اس کے لیے وہ ذمہ دار نہیں ہے اور اس کے لیے اس سے باز پرس نہیں ہو گی۔ لیکن جس نے ابلاغ کی ذمہ داری پوری نہیں کی، اس سے ضرور باز پرس ہو گی کہ تمھارے پاس حق تھا، تم نے کیوں نہیں پہنچایا؟ اسی لیے فرمایا ہے: وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ○ (الاعراف ۷:۶) ہم نے جن کو بھی بھیجا ہے ان کو حساب دینا ہو گا۔ اسی لیے روز محشر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ پوچھیں گے کہ ہم نے تم تک جو حق بات پہنچائی تھی، کیا تم نے اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا، یا نہیں۔ ان سے اس بات کا جواب طلب نہیں کیا جائے گا کہ انھوں نے دین کو قائم کیا، یا نہیں۔ البتہ تمام رسولوں اور امت مسلمہ کو اس بات کے لیے ضرور جواب دہ ٹھیرایا جائے گا کہ انھوں نے ابلاغ کا فریضہ انجام دیا، یا نہیں۔

اس لیے وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ کے معنی دراصل یہ ہیں، کہ تم لوگوں کو دین کی راہ پر زبردستی لانے کے ذمہ دار نہیں ہو۔ قرآن مجید نے یہ بات کئی مقامات پر مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے، مثلاً تم چاہو تو سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور چاہو تو سرنگ کھود کر زمین میں گھس جاؤ، لیکن لوگوں کو صحیح راستے پر لانا تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○ (الانعام ۶:۱۰۷)۔ یعنی ہم نے تم کو وکیل، محافظ یا داروغہ نہیں بنایا ہے۔ تم کو تو صرف یہ ذمہ داری دی ہے کہ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ کے مصداق تمھارا کام حق بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ جمع ہوں، ان کو لے کر جماعت بنانا، ان کا نظم کرنا اور اللہ کا نظام قائم کرنا، یہ تمام تفصیلات بعد کی ہیں، لیکن بنیادی ذمہ داری صرف ابلاغ کی ہے۔ یہ ذمہ داری اگر ادا نہیں ہو گی، تو تم اللہ کے ہاں قابل سرزنش ہو گے اور تم سے بازپرس ہو گی۔

اقامتِ دین میں شخصیت کا کردار

تحریک اسلامی کے طریقہ کار کے حوالے سے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ کوئی شخصیت یا انسان اتنا باکمال نہیں ہو سکتا کہ وہ مجمع عام پر ایک نگاہ ڈالے اور لوگ بدل جائیں۔ اس کی کوئی بنیاد دین اور قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاے کرامؑ کی نگاہ سے زیادہ کس کی نگاہ پاک اور بااثر ہو سکتی تھی؟ ان سے زیادہ کس کا کلام موثر ہو سکتا تھا؟ کس کے پاس ان سے زیادہ خلوص ہو سکتا تھا؟ اور کس کی شخصیت میں ان سے زیادہ کرامات اور معجزے ہو سکتے تھے؟

حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس تو یہ معجزہ تھا کہ اندھوں کی بینائی واپس آ جاتی تھی، کوڑھی اچھے ہو جاتے تھے اور مفلوج چلنے لگتے تھے، یہاں تک کہ مردے بھی زندہ ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن جو انھیں سننے اور دیکھنے کو تیار نہیں تھے، ان کو سننا اور دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ یہودیوں کے علما، فقہا اور عام افراد کانوں سے ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے کان، آنکھیں اور دل و دماغ بند کیے رکھتے تھے۔ ان کے دلوں کی دنیا بدلنے کے لیے یہ معجزات بے اثر ہوتے تھے، حالانکہ جسمانی طور پر مفلوج اور مردہ زندہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس سے بڑے معجزات تو کسی کے پاس نہیں تھے، لیکن وہاں بھی اللہ کے اسی قانون کا اطلاق ہوتا تھا کہ جو خود دیکھنا چاہے گا وہی دیکھے گا، جو خود سننا چاہے گا وہی سنے گا اور جو صراط مستقیم پر خود چلنا چاہے گا وہی چلے گا۔ غیب سے کوئی فرد نہیں آئے گا جو انسان کا ہاتھ پکڑ کر سیدھی راہ پر ڈال دے۔ یہ ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ راہ حق پر چلنے کی کوشش کرے۔ جو فرض ایک فرد پر عاید کیا گیا ہے، وہ فرض کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔

طاقت کے استعمال کا تصور

دعوت و تبلیغ اور تحریک اسلامی کے اصول و طریقہ کار کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ غیب سے سب کی اصلاح کا سامان ہو جائے، یا لوگ کہتے ہیں کہ "ایسے بے حس لوگوں کا علاج تو ڈنڈے کے علاوہ کچھ نہیں ہے"۔ یہ بات زبان زدعام ہے کہ "قوم اتنی بگڑ چکی ہے کہ اس کا علاج صرف ڈنڈا ہے"۔ لیکن ڈنڈے سے قوموں کا علاج نہیں ہوتا بلکہ ڈنڈے سے تو قوموں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر ڈنڈے سے قوموں کا علاج ہو سکتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ موثر ڈنڈا اور کس کا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو انبیاے کرام علیہم السلام کو ڈنڈا تھما دیتا اور پوری کی پوری قوم کی اصلاح ہو جاتی، لیکن ڈنڈے سے

© rasailojaraid.com